محمد علی جوہر کا شعری متن موت سے عشق کا استعارہ

پروفیسر مولا بخش
شعبۂ اردو، علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

اردو غزل کی شعریات میں عاشق مقتول اور معشوق قاتل کے روپ میں پیش کیا جاتا رہا ہے گویا کہ اردو غزل کی تخیلی دنیا میں معشوق کے لیے عاشق کی طرف سے شوق شہادت کے شعری اظہار کا ساختیہ ہمارے شعور اور اجتماعی حافظے کا حصہ رہا ہے جس کے ردّ تشکیل کے ذریعے شعرا غزل کی شاعری میں معنی آفرینی کے نئے نئے سیاق پیدا کرتے رہے ہیں۔

اردو غزل عہد بہ عہد جن جن تاریخی ادوار سے گزری، شوق شہادت کا سیاق وسباق بھی بدلتا رہا۔ متصوفانہ شعری روایت میں معرفت حق کے لیے فنا ہو جانے یا جان دینے اور خود کو مٹا دینے کی ایسی جاندار روایت رہی ہے جس سے اردو غزل کا قاری بخوبی واقف ہے۔ عہد غالب نے اردو غزل کے عاشق کے رویے میں بڑی تبدیلی کو نشان زد کیا اور عاشق کی انفعالیت کو ایک نیا زاویہ عطا کیا۔ یہاں عاشق کے مجہول کردار کے بجائے خود سے عشق کرنے یعنی خودداری کا جوہر اس کے کردار کا روشن پہلو ثابت ہوا۔ اس طرح جیسے جیسے سیاسی، سماجی اور ثقافتی صورتحال میں تبدیلی آتی گئی اور ہندوستان نے سیاسی کروٹیں بدلنی شروع کیں نتیجے کے طور پر شعروادب میں ایک نئے معشوق، عاشق نیز رقیب نے اپنا چہرا ابھارا، وطن، ملک اور قوم، حاکم اور محکوم کے علاوہ خدا اور اس کے احکامات (بطور معشوق) سامنے آئے۔

اردو غزل نے جن تہذیبی مدلولات سے اپنا رشتہ جوڑا انہیں ہند اسلامی روایات اور مشترکہ تہذیبی روایات کا نام دیا گیا ہے، جہاں ایک طرف پرہلاد نے توحید کے لیے جان دیتے ہوئے اکشیوروادی کی تعلیم دی تھی تو وہیں توحید خالص کے مؤید بھی تھے جن کے یہاں توحید کی اشاعت اور تحفظ ایمان کی سیکڑوں مثالیں عظیم شہادتوں کی صورت میں موجود تھیں۔ اسلام کی صدیوں کی تاریخ میں شہیدوں کی ایک ایسی کہکشاں ہے جسے محمد علی جوہر نے اپنے سینے کا نور بنالیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے تحفظ کے لیے شہادت کا جام نوش کرنے کی جو روایت اسلام نے قائم کی تھی اسے انھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں
عمر بھر میں یہی دانائی کی

یہاں ضمیر 'ہم' قابل توجہ ہے۔ یہ ایک ایسی قوم کا اجتماعی ضمیر اور ثقافتی طور ہے جہاں ہمیشہ جنون کی نذرِ عقل کو کرنے کی شاندار روایت رہی ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ محمد علی جوہر نے اس شعر میں اردو شاعری میں پہلے سے چلے آرہے عقل وعشق کے موازنے کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ پہلے مصرعے میں عقل کو جنون کی نذر کرنے کی بات کہی گئی ہے تو دوسرے مصرعے میں عقل کی مناسبت سے عقل کے مترادف لفظ 'دانائی' کا استعمال کیا گیا ہے جس کے ظاہری معنی عقل کے ہی ہوتے ہیں، لیکن جس اجتماعی ضمیر یا معاشرے کے لوگوں کے مزاج کے بارے میں شعر میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ دانائی اس کو کہتے ہیں کہ جہاں جنون کے لیے عقل کو بھی استعمال کر لیا جاتا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ نام نہاد عقل کے بجائے دانائی کے مفاہیم بالکل جداگانہ ہیں۔ یہ معاشرہ دانائی کے معنی پیش پا افتادہ عقل کو پس پشت ڈالتے ہوئے ایسی دیوانگی کا خواہاں ہے جہاں عقل اس کی چاکری کر رہی ہوتی ہے۔ یہ صدیوں پرانا وہی معاشرہ ہے جس کی باریکیوں سے محمد علی جوہر اس وقت واقف ہوئے تھے جب وہ شبلی کے درس قرآن کو چھپ کر سنا کرتے تھے جسے ہم لوگ اسلامی معاشرہ کہتے ہیں۔ جہاں صدیوں سے شوق شہادت کی آبیاری کی یہ شدید خواہش ایک سماجی انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کی گواہ رہی ہے۔ اسلامی شعار کے تحفظ اور انسانیت کے جوہر کے تحفظ کے لیے شہادتوں کی تاریخ میں ایک نام حضرت حسینؓ کا ایسا نام ہے جس نے شہادت کے بیانیہ کو ہر عہد کی سیاست اور حکمراں طبقے کے ظالمانہ رویوں کے خلاف احتجاج کی آواز کا استعارہ بنا دیا ہے جو ہر عہد میں ظالم کی آواز کو Subvert کرنے کے شوق کو جنون کی شکل عطا کرتا رہا ہے۔ یہی جنون محمد علی جوہر کی شخصیت کا جوہر بنا ہے اور یہی جذبہ ان کی غزلیہ شاعری میں ایک ایسے عاشق صادق کی تشکیل کرتا ہے

جس کی نظیر اردو شاعری میں کمیاب ہے۔

ملاحظہ فرمائیں نظم 'حسین' کے یہ اشعار:

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسانِ حسین
گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر
رہے کوثر پہ بھی وابستۂ دامانِ حسینؓ

جوہر معرکۂ کربلا اور اس کے ہیرو حضرت حسینؓ کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہوئے اپنی شہادت کو بھی حسینؓ کے دامن کا کرشمہ اور احسان ہر شہید پر محسوس کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں موت، قضا اور دار و رسن سے رومانس کرنے والا عاشق صادق جوہر محمد علی جوہر کی غزلیہ شاعری کا بنیادی حوالہ اور ان کی غزلوں کا مرکزی ساختیہ ہے شاید ہی اردو شاعری میں کہیں نظر آئے۔ موت سے رومانس کا مقصد ان کی غزلوں میں شرف انسانی کی بازیافت اور آزادی اور آگہی جو انسانیت کا جوہر اصلی ہے جس کی تعلیم انہیں حب نبوی سے ملی تھی اور جن کے سامنے آقائے نامدار محمد مصطفیٰؐ کا خود کی شہادت سے متعلق وہ روشن بیان تھا جس میں آقائے نامدار نے کہا تھا کہ ''میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کر دیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر۔'' یعنی اسلام کا فلسفۂ شہادت ان کا آئیڈیل تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

میرے لہو سے خاک وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سرگزشت
دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

مذکورہ بالا شعر میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ایک ایسے وطن کے اور وطن کے عاشق کے متلاشی نظر آتے ہیں جہاں مذہب اور وطن میں قطبینیت ہے ہی نہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ ہندوستان کو بھی اپنے اسلام کا ایک ایسا چمن قرار دیتے ہیں جس کا تحفظ اور جس کے لیے جان دینا دراصل ایک دوسرے کا پرتو ہے۔ دوسرے شعر میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ عشق کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب عاشق تختۂ دار پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی وہ نسل جس نے راست طریقے سے ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ جمانے والے ظالم انگریزوں کو باطل کے روپ میں دیکھا اور اپنے وطن کو اپنے ایمان کا جز سمجھتے ہوئے انگریزوں کے ناپاک پنجوں سے اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہا نیز جس نے غلامی کو شرف انسانی کا کوڑھ اور آزادی کو انسانیت کا جوہر قرار دیا ان میں جہاں بہت سے نام ہماری آزادی کی تاریخ کی روشن مثالیں ہیں تو وہیں محمد علی جوہر کی شخصیت اور ان کی شاعری موت سے رومانس یا عشق کا ایک ایسا استعارہ خلق کرتا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

مسٹر سے مولانا بننے تک کا سفر جوہر نے کیونکر طے کیا تھا اس پس منظر میں شاعری سے پہلے ان کی شخصیت بھی اپنے قارئین کے لیے انتہائی اہم متن بن جاتی ہے اس لیے خود ان کا ہی کردار ان کے اشعار میں واضح طور پر نظر آتا ہے، لیکن اس کے علاوہ ان کی شاعری میں ایک ایسے عاشق کا چہرہ بھی ابھرتا ہے جنھوں نے ان دہائیوں میں (جسے ہم بیسویں صدی کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی دہائی کا نصف قرار دیتے ہیں) موت سے رومانس کا منظر پیش کیا اور آزادی کے صحیح مفہوم کا احساس دلایا۔

جوہر بحیثیت مجاہد آزادی اتنے قد آور لیڈر بن کر ابھرے کہ ان کی شعری شخصیت پس پشت چلی گئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ جوہر پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد آزادی کی جنگ میں ایک منفرد سپاہی کے روپ میں ابھرے۔ اس جنگ میں ترکی جرمنی کے ساتھ تھا۔ ہندوستانی مسلمان ترکی کے ساتھ ہو گئے اس لیے انگریزوں نے اکثر مسلم سیاسی رہنماؤں کو نظر بند کر دیا۔ دوسرے اخباروں کے علاوہ محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ اس وقت شبلی، حسرت موہانی، اقبال، ظفر علی خاں، احمد پھپھوندوی، تلوک چند محروم، چکبست، ہاشمی فریدی، خوشی محمد ناظر نے اپنے شعروں کے ذریعے انگریز حکومت کی چولے ہلانی شروع کر دی تھیں۔ یہی زمانہ ہوم رول کی تحریک کا بھی ہے۔ برطانیہ نے ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مسلمان ترکی خلافت کو عالم اسلام کے تہذیبی اور سیاسی اتحاد کا مرکز سمجھتے تھے جس کے تحفظ کے لیے تحریک خلافت شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کا پروگرام مرتب ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس منعقد کی گئی اور علی برادران کو باغیانہ تقریر کے جرم میں دو سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں صدائے خاتون نام کی ایک نظم شائع کی گئی تھی جس کا مندرجہ ذیل شعر ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا اور ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان تھے وہاں وہاں محمد علی کے نام کی دھوم مچ گئی:

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ایک زمانہ آیا کہ ترکی میں خلافت ختم کر دی گئی۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی کا اعلان کیا اور سائمن کمیشن کے بعد ۱۹۲۸ء میں ڈومینین اسٹیٹ کی

آواز اٹھی اور مکمل آزادی کی مانگ پورے ملک میں کی جانے لگی۔اس پورے عرصے میں محمد علی ہندوستانی سیاست میں ہیرو کے روپ میں ابھرے۔قید و بند کی صعوبتیں ان کا مقدر بن گئیں اور ملک کی آزادی کے لیے جان دینے کا جذبہ اپنی حدوں کو چھونے لگا۔جس شاعر نے بھی ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو'' جیسا مصرع نظم کیا ہے وہ حقیقت حال ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے مضمون ''محمد علی جوہر کی شاعری اور جذبۂ حریت'' میں لکھا ہے:

''نور الرحمٰن نے لاہور سے دیوان جوہر کا جو ایڈیشن شائع کیا تھا،اس میں مولانا کی نایاب تحریروں کا عکس بھی ہر غزل کے ساتھ شائع کیا گیا ہے جو پاکستان قومی میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان غزلوں کے اوراق جیلر کے دستخط اور مہر لگانے کے بعد باہر بھیجے جاتے تھے۔ان غزلوں میں خاصی تعداد ایسے اشعار کی ہے جن میں ذوق شہادت،قتل یا واردات قتل کی کیفیت ہے۔اس کیفیت کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا کی غزل کا منظر نامہ اور ان کی شعری امیجری قتل و شہادت اور خون سے عبارت ہے۔''[1]

بلا شبہ مولانا محمد علی جوہر عظیم مجاہد آزادی،صحافی بے بدل،شعلہ بیان مقرر،ملی سیاست کے مرد میداں،لیکن ان کے اندر قومی لیڈر کے علاوہ ایک توانا قومی شاعر بھی پوشیدہ تھا جس کی طرف ہمارے ناقدین کی نگاہ نہیں گئی ہے۔اس کا احساس جوہر کے ناقدین مثلاً گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر آفاق احمد آفاقی کو بھی ہے۔مذکورہ بالا عبارت میں پروفیسر نارنگ نے اس امر پر توجہ مبذول کرائی ہے کہ مولانا کی غزلیں کیونکر قتل و شہادت کی امیجری سے عبارت ہیں۔ساتھ ہی یہاں یہ بات بھی نشان زد کرنا ضروری ہے کہ مولانا محمد علی جوہر فطرتاً شاعر کا دل رکھتے تھے جس پر ان کی دوسری مصروفیات کا بوجھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر محمد علی جوہر کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ فرمائیں:

''آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں..... رامپور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔داغؔ،امیرؔ، تسلیم،عروج،دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔''[2]

ڈاکٹر اکمل ایوبی نے بھی لکھا ہے:

''مولانا محمد علی جوہر کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا اور نو دس برس ہی کی عمر میں اپنا تخلص جوہرؔ رکھ لیا تھا۔رام پور میں داغؔ کی صحبت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور علی گڑھ میں اچھے خاصے شاعر بن گئے لیکن قومی و ملی مصروفیت کی بنا پر شعر و شاعری کے لیے کم ہی وقت ملا۔خود مولانا نے ہی تحریر کیا ہے کہ ''جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہو جاتا ہے تو بہ غایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔''[3]

جوہر نے شاعری سے اپنی فطری نسبت کا ذکر بہت ہی شد و مد کے ساتھ دوسرے موقعوں پر بھی کیا ہے اور اسے اپنا بنیادی ذہن قرار دیا ہے۔ داغ کی صحبت نے ان کی شاعری کے جوہر کو نکھارا ضرور تھا،لیکن ان پر غالب اور اقبال کے شعری امتیازات کے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری کی اشاعت میں جوہر کا اہم رول رہا ہے۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انھوں نے غالب اور اقبال کا تتبع کیا تھا۔آج کی تنقید کی زبان میں اس رویے کو بین المتنیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔محمد علی جوہر نے ایک طرح سے اپنی شاعری کی دنیا الگ بنائی تھی جس میں ان کا بنیادی سروکار موت سے رومانس ہے۔یہ مضمون ارتکاز اور شدت کے ساتھ محمد علی جوہر کے یہاں بہ تمام و کمال ابھر کر سامنے آیا ہے۔انھوں نے غزل کے روایتی مزاج کے اشعار میں بھی اپنی سی انفرادیت کے عکس چھوڑے ہیں۔اس سلسلے کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آج جی بھر کے دیکھ لینے دو
کل کو دل کھول کر ستا لینا

تجھ سے درد ہجر کہتا کون کس کی تھی مجال
فتنۂ صد حشر خوابیدہ تری چتون میں تھا

ہاتھ تو ہوں گے قلم پر نامہ بر یہ بھی کہا
دل چرا لیتی ہے پہلو سے یہ وہ تحریر ہے

بتانے کی ضرورت نہیں کہ شعر و ادب کا یہ رچا ہوا ذوق اور شعور جو مذکورہ بالا اشعار میں نظر آ رہا ہے وہ غزل کی شعریات سے جوہر کی فطری مناسبت کا کھلا ثبوت ہے۔پہلے شعر پر داغ کا گمان ہوتا ہے تو اخیر والے شعر پر غالب کے ان اشعار کی چھوٹ پڑی ہے جنہیں ہم غالب کی سہل ممتنع کی شاعری قرار دیتے رہے ہیں پھر بھی مجال ہے کہ جوہر پر ناقدین تتبع کا الزام لگا دیں،لیکن سچ یہ بھی ہے کہ جوہر کی شاعری کا اصلی جوہر نہ ان کی نظم میں ہے اور نہ ان کی روایتی غزلیہ شاعری میں۔دراصل ان کا شعری ذہن وہیں پر اپنی انفرادیت کا نقش قائم کرتا نظر آتا ہے جہاں انھوں نے اشعار میں سیاسی لاشعور اور صدیوں پرانی شوق شہادت کی روایت کو قاری کے حافظے میں لانے کی سعی کی ہے۔اردو غزل میں حسرت سے بھی

پہلے خالص سیاسی لب و لہجے کی شاعری جوہر سے ہی منسوب کی جاسکتی ہے جہاں اردو غزل کے صدیوں پرانے معشوق نے وطن کا روپ اور رقیب نے ظلم و استبداد کا اور آزادی سلب کرنے والے ظالم کا روپ دھارلیا اور اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلانے والے لاکھوں ہندوستانیوں نے عاشق کا روپ دھارلیا ہے۔یعنی انہوں نے اردو غزل کے خیالی کرداروں کو Demystify کر دیا ہے۔آزادی کا متصوفانہ اور فلسفیانہ تصور اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن آزادی کا سیاسی تصور معاصر ادب کا اختصاص بن چکا ہے جہاں کولونیل آقاؤں کی ذہنیت کا پردہ فاش کرتے ہوئے شعرا و ادبا اس بات کا احساس دلا رہے ہیں کہ آزادی انسان کا جبلی شعور ہے اور انسان کی تخلیقی قوت کی آواز ہے۔سیاسی تبدیلی آزادی کا ایک اہم اور ناگزیر پہلو ہے جس پر زور دینا کسی جنگ سے کم نہیں اور جس کے لیے اپنی جان دینا شہادت سے کمتر شے نہیں۔محمد علی جوہر کا اس سیاسی آزادی پر زور ان کے تاریخی شعور اور سیاسی لاشعور کی بھی آواز ہے۔

جوہر کے لیے لفظ 'آزادی' صرف سیاسی مفہوم کے سیاق تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں فرد کی خودداری، خدا پرستی اور ایمان کا جوہر بھی شامل تھا۔وہ اپنی نثری تحریروں میں بالخصوص ہمدرد کے کالموں اور اداریوں میں اس لفظ کو کبھی فراموش نہیں کرتے اور اس کے لیے جان دینے کی تمناؤں کا اکثر اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔آزادی اور ایمان کا سبق انھوں نے اپنے مذہب سے پڑھا تھا۔ہمدرد کے اداریوں سے ماخوذ کچھ عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

''ہندوستان کی طلب آزادی کی تاریخ صحیح معنوں میں ۱۹۲۰ء سے شروع ہوئی ہے کہ جب ناگ پور کانگریس نے اپنا نصب العین ''ہندوستان کے لیے جائز اور پرامن طریقے سے سوراج حاصل کرنا'' مقرر کیا۔''[۴]

''ہندوستان والے انگلستان کو کس طرح ''مادر وطن'' کہہ سکتے ہیں؟ اور انگلستان والے کالے ہندوستانیوں کو کیسے اپنے برابر بٹھا سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان ''کامل آزادی'' کے مطالبہ پر برابر قائم ہے اور نوآبادیات کے درجہ کی حکومت کے جال میں کسی طرح پھنس نہیں سکتا۔''[۵]

''باوجود اس کے کہ ۱۹۲۰ء میں آزادی کی عظیم الشان تحریک شروع ہوئی لیکن ہم نے اپنی زبان سے ایک دفعہ بھی ''مکمل آزادی'' کا لفظ نکالنے کی جرأت نہ کی۔ہم ''سوراج'' ہی ''سوراج'' کہتے رہے۔ہم نے اس کو اپنا مقصد ضرور قرار دیا، لیکن اس کی تشریح کبھی نہ ہوسکی۔برطانوی نوآبادیات کے درجہ کی حکومت خود اختیاری بھی اس کا مفہوم سمجھا گیا اور آئرلینڈ کی طرح ہوم رول بھی، کیوں کہ ہم میں بہت سے ایسے تھے جو سلطنت برطانیہ کے سایۂ عاطفت سے نکلنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتے تھے۔''[۶]

وائسرائے کی دھمکی کے عنوان سے اداریہ میں وائسرائے کی طرف سے کامل آزادی کے حصول کے لیے کوشاں مجاہدوں کو دھمکی دینے کے خلاف اداریہ میں لکھتے ہیں:

''ہز اکسی لینسی یقین فرمائیں کہ وہ ان خطرات، مشکلات اور شدائد سے اچھی طرح آگاہ ہیں جو ملکوں کو اپنی آزادی کے حصول میں پیش آتے ہیں اور ہندوستان کو اپنی اس جدوجہد میں پیش آئیں گے۔کامل آزادی کے طلب گاروں میں ایسا ناواقف شاید کوئی نہ ہوگا جو یہ سمجھے کہ اسے بغیر مصیبتوں کا سامنا کیے ہوئے آزادی مل جائے گی۔کامل آزادی کے حصول میں جن خطرات کی طرف ہز اکسی لینسی نے اشارہ فرمایا ہے محبان وطن اور بہی خواہان ملک اسے پہلے ہی سے سمجھ رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایک غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے میں انہیں اس کی قیمت کس قدر ادا کرنی پڑے گی۔''[۷]

گویا کہ آپ نے مذکورہ بالا عبارتوں میں وہ جوش اور ولولہ اور صحیح آزادی کی فکرمندی کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔محمد علی جوہر نے اپنی مجاہدانہ شخصیت کے زیر اثر آزادی کی جنگ کا ایسا بگل بجایا اور سامراجی قوتوں سے ایسی ٹکر لی جس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں میں ملی بیداری پیدا کرنے کے سلسلے میں بھی ہندوستانی سیاست میں ایک ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر کم ملتی ہے۔حریت پسندی کے ایک ایسے مقام پر مولانا محمد علی جوہر کا ذہن پہنچ چکا تھا کہ وہ مکمل آزادی کے علاوہ کوئی اور سودا اپنے ذہن میں رکھتے ہی نہیں تھے۔دراصل ان کا ذہن مجاہد کا اور دل شاعر کا تھا۔یہی وجہ ہے کہ عاشقی اور آزادی ان کی شاعری میں ایک ہی سکے کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں۔قید فرنگ کے دوران انھوں نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں ایک مجاہد کی تڑپ اور آزادی کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ یہاں تک کہ اپنی جان تک دے دینے کا جنون ان کے شعروں کا اہم پیکر بن گیا ہے۔وہ پورے کے پورے جذبۂ آزادی اور حریت کا پیکر بن گئے تھے اور انہیں احساس تھا کہ اپنی جان کی قربانی دیے بغیر آزادی کی دیوی سے وصال ممکن نہیں۔اس لیے ان کی شاعری میں موت سے عشق یا رومانس کا ایک ایسا شعری اظہار ملتا ہے جو ان کی غزلوں کو

شاعروں کی بھیڑ میں دور سے ہی پہچان لیے جانے کا وصف پیدا کرتا ہے۔اس کے لیے انھوں نے اپنی شاعری میں کربلا اوراس کے متعلقات کو بطور کوڈ یا علامت کے روپ میں برتا ہے۔ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس حوالے سے کچھ اشعار پر ایک نگاہ ڈال لی جائے جس میں خواہش مرگ یا شہادت کے شوق یا اپنی جان قربان کر دینے کا جنون یا آزادی کے لیے موت سے کھیلنے اسے گلے لگانے یعنی موت سے عشق کا جانفزا منظران کی شاعری کا بنیادی ساختیہ بن گیا ہے:

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

ہم اس کی راہ میں مرنے کی دیکھتے رہے راہ
ذرا سا کام تھا وہ بھی قضا سے ہو نہ سکا

پیام مرگ ہے پیغام یار و مژدۂ وصل
وہ کام اجل نے کیا جو صبا سے ہو نہ سکا

ہے قبل مرگ ہی اعدائے دیں کی واویلا
ابھی ہوا ہی کہاں ہے عذاب دیکھو تو

ملتی نہیں کسی کو سند امتحاں بغیر
دار و رسن کے حکم کو سمجھو صلائے دوست

جو آرزوئے مرگ میں مرتے تھے وہ کشتے
کس منہ سے شکایت تری جلاد کریں گے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

دل و جان سونپ چکے ہم تجھے اے جان جہاں
اب ہمیں خوف ہی کیا اپنی گرفتاری کا

اجل استادہ ہے بالیں پہ مریض غم عشق
آنکھ تو کھول ذرا وقت ہے بیداری کا

پوچھتے کیوں ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندہ جیل خانے کے

کہتے ہیں نقد جاں جسے یہ عاشقوں پہ قرض
یہ فرض جلد ہم سے ادا ہو سکے تو جانیے

ساز بھی چاہیے اب کچھ نہ اتارو دم ذبح
رقص بسمل ہے تو زنجیر کی جھنکار بھی ہو

اللہ کے رستے میں ہی موت آئے مسیحا
اکسیر یہی ایک دوا میرے لیے ہے

مذکورہ بالا اشعار میں 'خواہش مرگ' اور واصل بحق ہوجانے کی وہی صدیوں پرانی غزلیہ روایت میں ڈھلی ہوئی خواہش معلوم ہوتی ہے جسے ہم فنا فی اللہ کہتے ہیں،لیکن یہاں اس خواہش کے عقب میں آزادی حاصل کرنے کا خواب اور تمنائیں مچل رہی ہیں۔ اخیر کے دو شعروں کو ذرا غور سے پڑھیے۔شوق شہادت اور موت کو ہنستے ہنستے گلے لگانے اور اسے اپنا مسیحا قرار دینے کے مضمون نے ان کی غزلیہ شاعری کو جیسے سرمدی آواز سے جاملایا ہے۔دم ذبح کچھ نہ اتارو سے مراد ہے آزادی کے متوالوں کے پاؤں میں ڈالی گئی زنجیر۔یہی زنجیر ذبح کے وقت موسیقی کا کام کرے گی جب عاشقِ آزادی درد سے تڑپے گا اور زنجیر سے آواز پیدا ہوگی۔یہی آواز کسی ملک کا ترانہ بنے گی۔جوہر کے نزدیک موت دراصل صبح کی علامت ہے اور عاشق کی جان جیسے اس پر آزادی کا قرض ہے جسے جلد از جلد ادا کرنا ضروری ہے۔علاوہ ازیں اسی مناسبت سے ان کی غزلوں میں دار و رسن یادار،کفن، پیائے کربلا، گلہائے کربلا، ایمائے کربلا، سودائے کربلا، شیدائے کربلا،دنیائے کربلا کے علاوہ فنا،موت،قضا،اجل،مرگ سے متعلق متعدد اشعار نظر آتے ہیں۔مثلاً کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

خون عاشق سے سخت ہیں بیزار
ملک الموت اس زمانے کے

حیات جاوداں کیا خاک ملتی مر کے زاہد کو
اسے تو موت سے پہلے ہی مشت استخواں پایا

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزہ ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

کوثر پہ کھلا کیوں نہ اجل آج کا روزہ
پہنچا نہ دیا ہم کو در پیر مغاں تک

عاشقوں کے لیے ہے دار ہی داروئے شفا
عشق کی طب میں دوا نام ہے بیماری کا

پہلے شعر میں لفظ 'فنا' کا سیاق وہی ہے جو تصوف میں ہے۔یعنی فنا دراصل بقا کا ضامن ہے۔فنا منفی قدر نہیں،لیکن یہاں فنا وطن کے عشق میں اور آزادی کی خاطر خود کو مٹانے کا نام ہے جس کا حاصل شرف انسانی ہے اور یعنی ملک کی بقا بھی ہے۔دوسرے شعر میں غزل کا رقیب یعنی اس کا

سیاسی مفہوم حاکم وقت یعنی انگریز ہے جس کی نیندیں پے در پے عاشقوں کے خون نے اڑادی ہے۔ تیسرے شعر میں موت سے ڈرنے والوں پر طنز کیا گیا ہے۔ چوتھے شعر میں موت کی راہ دیکھنے والوں کی اس لذت کا ذکر کیا گیا ہے جو انہیں ایسا کرتے ہوئے زندگی کے اصل ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔ آخری شعر میں تختۂ دار کو عاشق کا شفاخانہ قرار دیا گیا ہے۔ موت سے اس قدر کے عشق پر مبنی مضامین پر مبنی غزلیہ شاعری کی مثال جوہر کے علاوہ شاید ہی اردو غزل کی تاریخ میں ملے۔ آفتاب احمد آفاقی نے اپنی کتاب 'محمد علی جوہر: شخص اور شاعر' میں لکھا ہے:

''جوہر نے کربلا اور حسینؓ کے استعاروں سے اپنی شاعری میں بڑا کام لیا ہے۔ کربلا ان کے یہاں خیر وشر اور حق و باطل کی معرکہ آرائی کی علامت ہے اور حسینؓ نیکی کا پیکر ہے۔ جوہر نے حسینؓ اور کربلا کی علامتوں اور پیکروں کے ذریعے اپنی زندگی کی پوری داستان رقم کردی ہے اور اپنی شاعری کو ایک نیا مفہوم اور نئی جہت عطا کردی ہے۔ یہ خصوصیت اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ان اشعار سے قطع نظر جن میں حسینؓ اور کربلا کے پیکر استعمال کیے گئے ہیں۔ انھوں نے لہو، قتل اور شہادت جیسے الفاظ کے ذریعے بھی اپنے ولولہ انگیز جذبات کا اظہار کیا ہے اور ان میں بھرپور معنویت پیدا کردی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں: ''ان کے اشعار کی فضا خون سے لت پت ہے۔ ذیل کے اشعار سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی''۔[۸]

بیتاب کر رہی ہے تمنائے کربلا
یاد آرہا ہے بادیۂ پیمائے کربلا
بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی
ہو جائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا
کرنے کو یوں ہزار کریں سینہ کو بیاں
ہے چند ہی کے واسطے دنیائے کربلا
مسلم اجل سے دور نہیں روز کربلا
رہتا نہیں برات میں دولہا دولہن سے دور

گویا کہ محمد علی جوہر نے ہندوستان کی جنگ آزادی اور کربلا دونوں کو جیسے یکجا کردیا ہے۔ یہاں کربلا جوہر کا سیاسی لاشعور اور دینی جمالیات کا ایک ایسا حافظہ ہے جو ان کے شعروں میں موجود مجاہد کا ایما بن چکا ہے جس کی ایک ہی تمنا ہے جس کا واشگاف اظہار مندرجہ ذیل شعر میں ہوا ہے:

ہم کو خود شوق شہادت ہے گواہی کیسی
فیصلہ کر بھی چکو مجرم اقراری کا

انھوں نے خود شہادت کے شوق کے سلسلے میں کچھ اس طرح کا بیان دیا ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری کے اندر ایک عجیب وغریب قسم کا احساس اور ولولہ پیدا ہوجاتا ہے:

''۲۰/اکتوبر لاہور کے جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ: انگلستان سے واپسی کے بعد مسلسل تقریروں کی وجہ سے میرا گلا بیٹھ گیا ہے، اب پھانسی کے بعد ہی ٹھیک ہوسکتا ہے۔''[۹]

موت سے ہمکنار ہونے اور اس سے عشق کرنے اور آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کردینے کے جذبے کو ان کی غزلیہ شاعری میں جس طرح کے رموز وعلائم کے سہارے پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری موت سے رومانس کا ایک ناقابل فراموش عرصہ خلق کرتی ہے۔ جوہر کی شاعری میں دیکھنے والی اور محسوس کرنے والی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمیں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جیسے زندگی موت کی طرف ہر لحہ ہجرت کررہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی ذہن ہمیشہ موت کے خلاف رہا ہے اس لیے دنیا کے ہر انسان کی قسمت میں موت جیسی پراسرار شے کو سمجھنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جوہر نے موت کو ہمیں (Crescendo) یعنی گیت کے چڑھتے ہوئے سروں کے روپ میں محسوس کرنے کی طرف راجع کیا ہے۔ گیت گانے والا جیسے جیسے سر کو بلند کرتا ہے اپنی ہستی اور اپنی شخصیت کو ان سروں میں جیسے گم کردیتا ہے۔ ان کے اشعار میں بھی اسی نوع کا سر یعنی شوق شہادت کی لے تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی ہے۔ جوہر کے نزدیک عظیم مقاصد کے لیے اپنی جان کی قربانی شرف انسانی اور آزادی کا الوہی سر ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یعنی موت عاشق صادق کی تکمیل کا ذریعہ ہے اور عشق اس کا دروازہ ہے۔ اردو غزل میں عشق پر توجہ کیوں دی گئی ہے؟ یہاں پر اس کا جواب اور جواز دونوں موجود ہے۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ شاندار طریقے یعنی حظ وانبساط اور جمالیاتی طریقے سے موت چاہئے یا غصے، لالچ اور حسد میں کی جانے والی جنگ کے دوران موت۔ دراصل جو لوگ کسی عظیم مقصد کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کرتے وہ دراصل موت کے بجائے عشق کو لابدی سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے لیے موت بے معنی ہوجاتی ہے۔ جب آپ کا عشق بار بار آپ کو موت کی یاد دلائے تو سمجھئے آپ کا عشق وہ چاہے مخالف جنس سے ہی کیوں نہ ہو یا اپنی قوم وملک سے ہو یا اپنے دین سے، تو سمجھئے وہ

اپنی انتہا پر ہے۔ بحیثیت شاعر محمد علی جوہر نے اپنی شاعری میں ایسے ہی ایک عاشق کے کردار کی تشکیل کی ہے تو دوسری طرف بحیثیت مجاہد آزادی انھوں نے خود بھی ایک ایسے ہی عاشق صادق کا کردار پیش کیا ہے۔ اس کا کھلا اظہار انھوں نے اس وقت کیا جب وہ بذات خود ۱۹۳۱ء میں خرابیٔ صحت کے باوجود اپنے رشتے داروں اور اہل خانہ کے منع کرنے کے باوجود راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے لیے لندن گئے اور انھوں نے نوآبادیاتی جبر واستبداد کے خلاف نوآبادیاتی آقاؤں کی کانفرنس میں ہی اپنی جان کی پروا کیے بغیر حق و صداقت کا علم بلند کرتے ہوئے ہندوستان کی آزادی کی مانگ کچھ اس طرح سے پیش کی:

''میں آپ سے ڈومینین اسٹیٹس مانگنے نہیں آیا ہوں.... مکمل آزادی کے سوا کوئی اور چیز قبول کرنے کے لیے میں تیار نہیں ہوں... لیکن اس کے بغیر اگر واپس جانا پڑا، تو باور کیجیے کہ ایک ایسی ڈومینین میں واپس جائیں گے جو آپ کے ہاتھ سے نکل چکی ہوگی، ہم ایک نئے امریکہ کو واپس جائیں گے..... میں اسی حالت میں اپنے ملک کو واپس لوٹنا چاہتا ہوں جب آزادی کی روح میری مٹھی میں ہو، ورنہ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا، بلکہ ایک غیر ملک میں مرنے کو ترجیح دوں گا، بشرطیکہ وہ آزاد ملک ہو۔ ہندوستان کی آزادی کا پروانہ اگر آپ مجھے نہیں دیتے تو پھر یہیں قبر کے لیے مجھے جگہ دینی ہوگی۔''[۱۰]

یہ آواز ہندوستان کی جنگ آزادی کی لاکھوں کروڑوں آوازوں میں دور ہی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ یہ آواز ایک ایسے مجاہد اعظم کی آواز تھی جس نے ہمیں قیامت تک کے لیے آزادی کی قدر و قیمت، اس کی اہمیت اور اس کی برکتوں کا احساس دلا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ آواز ہمارا پیچھا آج بھی کر رہی ہے اور ہمارے دامن دل کو جھنجھوڑ رہی ہے۔ یہ صرف ایک مجاہد کی آواز نہیں تھی، یہ ایک انسانیت نواز اور دردمند دل رکھنے والے ایک ایسی غزل کے شاعر کی بھی آواز تھی جس نے پوری زندگی اپنی شاعری میں آزادی کے لیے جان قربان کر دینے کے استعارے کی تشکیل میں اپنے آپ کو منہمک رکھا۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے مضمون میں صحیح لکھا ہے:

''ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے، لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی۔ عالم پر موت اپنا شکار خود منتخب کرتی ہے، محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا۔! اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا۔ ارفع و ارجمند!''[۱۱]

ایسا لگتا ہے کہ شاید جوہر کے ذہن میں امام حسینؓ کے کربلا میں محصور ہونے اور حق کے لیے شہادت پیش کرنے کا منظر اور صرف وہی ایک منظر زندگی بھر ان کی آنکھوں کے سامنے بار بار آتا رہا تھا۔ اس وقت بھی جب وہ ظالم حکمراں کے سامنے گول میز کانفرنس میں آزادی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ گویا اپنی آزادی یا اپنی آئیڈیالوجی کے لیے مرنے کی باتیں کرنے، دوسروں کے لیے اور اسی کوشش کے لیے شدت اختیار کرنے کے لیے اسے مجبور کرتی ہے۔ جوہر کی موت کا اعلان محض ایک سیاسی احتجاج نہیں تھا بلکہ وہ پورے عالم انسانیت کے لیے ایک دردانگیز پیغام تھا اور ان کا اپنی قبر کے لیے زمین کی مانگ کرنا پوری دنیا میں فلسفیانہ شہادت کی ایک مثال بن گئی۔ ایک ایسے مجاہد کی شاعری میں اسی طرح کے ایک مجاہد کا کردار پیش کیا گیا ہے جو رہ رہ کر ہمیں سر اٹھا کر جینے کا ہنر عطا کرتا ہے اور حق کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جوہر کی شاعری اس لحاظ سے اردو شاعری میں ایک ایسی آواز تھی جو دوبارہ سنی نہیں گئی۔

حواشی

۱۔ گوپی چند نارنگ، کاغذ آتش زدہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء، مضمون: محمد علی جوہر کی شاعری اور جذبۂ حریت، ص: ۲۵۵

۲۔ مجاہد اعظم مولانا محمد علی جوہر۔ مرتبہ: فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو، میری شاعری: محمد علی جوہر، ص: ۳۰۷

۳۔ مضمون: مولانا محمد علی کی شوخی اور حاضر جوابی، ڈاکٹر اکمل ایوبی، ص: ۱۴۰

۴۔ انتخاب ہمدرد، مرتبہ: صباح الدین احمد، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۷۶ (ہمارا مطالبہ)

۵۔ ایضاً، ص: ۱۷۸

۶۔ ایضاً، (مکمل آزادی، مدراس کانگریس کا فیصلہ)، ص: ۱۳۸

۷۔ ایضاً، (وائسرائے کی دھمکی) ص: ۱۸۷، ۱۸۸

۸۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، محمد علی جوہر: شخص اور شاعر، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۹۷

۹۔ مجاہد اعظم مولانا محمد علی جوہر، مرتبہ: فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص: ۱۵، ۲۵

۱۰۔ ایضاً، مولانا محمد علی۔ سیاسی جائزہ، عتیق صدیقی، ص: ۱۸۵، ۱۸۶

۱۱۔ ایضاً، مضمون: مجاہد اعظم کا انتقال، پروفیسر اختر الواسع، ص: ۲۷۶

◆◆◆